میں ملتجی ہُوا کہ سنوں طبعزاد کچھ ق فرمایا عشق نے کہ یہ دردِ زبان ہے اب
طاقت نہ کہنے کی نہ سمجھنے کا حوصلہ
فکر و تلاش شعر و سخن رائگاں ہے اب

چل گیا ہے شوق میں کس رہگذر سے آفتاب
ایکدم بھی دم نہیں لیتا سفر سے آفتاب

دل کو روشن کرنا داغ عشق کا ہی کام ہے
مطلقاً واقف نہیں ہے اس ہنر سے آفتاب

حسن انکا دل کو خوں کرتا ہے کس رنگ سے
لعل پتھر کو کرے فیض نظر سے آفتاب

سینہ اسکا جو گریباں سے نظر آنے لگا
ہے ید بیضا کہ نکلا اس کے بر سے آفتاب

آنکھ اپنی مہر و مہ کے نور سے روشن نہو
کاش نکلے اک کسی در بند گھر سے آفتاب

ہے طریق شوق سے ہر ایک دب کو کیا خبر
طے کیا کرتا ہے یہ رہ اپنے سر سے آفتاب

آئینہ اسکے مقابل دیکھ کے حیران ہوں
ہو گیا کیسا قریں دن کو قمر سے آفتاب

اس کے جلوے سے جو اختر آنکھ سے گرنے لگے
گر پڑا یکبار گی سب کی نظر سے آفتاب

داغ پر دو دِ جگر آخر کہن ہو جائے گا
عشق دیکھا کس نے ہے خالی خطر سے آفتاب

آنکھوں سے نہ دور یوں پھرا کر
دل کو تو مرے ذرا جدا کر

اُس بحر جمال سے بچا کر
دیتا ہے ڈبا وہ آشنا کر

کیا فائدہ میری جستجو کا
گویا میں گیا ہوں اس کو پا کر

ہجراں بھی کوئی بلا بری ہے
ڈرتے ہو جو تم مجھے ڈرا کر

بیخواب و خورش ہیں ہجر میں ہم — مر جائیں گے یار کچھ بھی کھا کر
مجلس میں ذلیل ہم نہ ہوتے — دیتے نہ اُٹھا جو تم بٹھا کر
سُنتا نہیں میری میں سُنوں کیوں — جو چاہے سو تو مجھے کہا کر
مِلنا ہے محال اس کا یوں ہی — سو بار پھر آئے ہم بھی جا کر
ہم جان سے جانے مستعد ہیں — اے کاش کہ دیکھے وہ بھی آ کر

حالت ہے مری تباہ اے عشق
تو بھی مرے حق میں کچھ دُعا کر

شرمندہ اس قدر ہوئے اپنی رضا سے ہم — اب کے قضا کرینگے کسی کی ادا سے ہم
بے پردہ پردے میں کسی پردہ نشیں سے ہیں — عینک صفت حجابِ بصیرت فزا سے ہم

دل باغ باغ اور مُعطر دماغ ہے
کیا بہرہ یاب عشق ہیں شعرِ ذکا سے ہم

تم سے آپسمیں جُدائی ہی تو مِل مِل دونوں — نالہ زار کیا کرتے ہیں، میں دل دونوں
دولتِ حُسنِ خداداد ہی تم کو دیکھو — آنکھیں اپنی ہوئی ہیں کاسۂ سائل دونوں
مرغِ دانا کے لئے دانہ و دام ایسا ہو — گھات میں رہتے ہیں دل کے وہ خط اور تِل دونوں
کیا دِوانہ ہے ان آنکھوں سے حذر کر اے دل — ترک بدمست نظر آتے ہیں جب مائل دونوں
بیوفائی و وفا میں جو چلی بحث تھی کل — میں ادھر یار اُدھر، ہو گئے قائل دونوں

وصل و ہجراں کے سِوا دل ہے رہِ عشق میں کیا

منزلیں ہوتی ہیں تیرے لیے مشکل دونوں

مظہر کشمکش یاس و تمنا میں ہوں — پر بتانا کہ ترے عشق میں کیسا میں ہوں
مطلقاً مجھ کو نہیں اپنے دل و جاں کی خبر — جب سے اے شوخ ترا عاشق شیدا میں ہوں
دوری اہل نظر مانع نظارہ نہیں — آئینہ ہے کہ ترا محو تماشا میں ہوں
دل اگر سرد ہوا داغ کے مرجھانے سے — عشق کہتا ہے نہ کھا غم چمن آرا میں ہوں
ان کے شکوے کا بھی موقع نہیں ملتا مجھ کو — کیا کروں کشتۂ صد تہمت بیجا میں ہوں
قابل دید ہے یہ جوش بہار تازہ — گل ہے سودا ترا اور بلبل گویا میں ہوں
وحشت شہر دلا یا در لاتا ہے جنوں — ہوں تو صحرا میں مگر عابر دریا میں ہوں
عارضی گرچہ تعلق دل کا نہیں ہے میرے — زہا صبر تو سرگرم مداوا میں ہوں
اپنی قسمت کے لکھے کا کرے کیا کوئی علاج — تختۂ مشق بنا بہر اطبا میں ہوں
توڑ کر عہد کبھی تم تو پشیماں تھے — سر سے لے تا بقدم شرم تقاضا میں ہوں
لطف وہ چند کہتا ہے دہن کا نقطہ — الف اس قد کا جو کہتا ہے کہ یکتا میں ہوں
کچھ نہ سمجھا کہ ہے کیا خوبی موزوں طبعی — بسکہ غارت زدہ نشۂ انشا میں ہوں

کیا کہوں کس سے کہوں کون ہے سنتا اے عشق
بزم میں ہوں بھی اگر جان کہ تنہا میں ہوں

ہے درد کونسا کہ بیاں میں نہاں نہیں — دل سوز مثل شمع ہماری زباں نہیں
یہ کیا غضب ہے گر ترے منہ میں زباں نہیں — ہر دم نہیں نہیں ہے کبھی ایک ہاں نہیں

کیا کیا کشیدہ ہم سے وہ ابرو کماں نہیں
تڑپے ہے دل کہ تیر نگہ کا نشاں نہیں

حیراں ہوں میں کہ کیوں ہے نظر یوں جھکی ہوئی
تیری یہ خوابِ ناز تو ایسی گراں نہیں

اُس کی نظر ہے صاعقہ برقِ طپاں ہے دل
کس طرح پہنچے تیر بہر آشیاں نہیں

پیاسی مرے لہو کی تھی قاتل کی تیغ کیا
زخمی ہوں چور چور مرا خوں رواں نہیں

چرچا ہے تیغ ابروئے قاتل کا جس جگہ
جز خون و قتل دل اور سخن درمیاں نہیں

جس کے سبب سے چھوٹ گئے دوستوں سے ہم
ہے ہے ہمارے حال پہ وہ مہرباں نہیں

فرہاد و قیس اُٹھ گئے دُنیا سے کیا ہوا
ان کی جگہ میں ہم ہیں کہ خالی جہاں نہیں

کم سایۂ ہما سے نہیں ہے فروغِ شمع
اس کے بھی تن کی قوت بجز استخواں نہیں

سر رکھ ہی دیگا آکے اک روز آفتاب
ایسا بلند یار ترا آستاں نہیں

فرطِ الم سے تابِ سخن کب رہے ہے عشق
آوارہ ہے خیال تو دل میں تواں نہیں

کب حرفِ شکوہ داغ سا مُہرِ دہاں نہیں
مانندِ غنچہ کب ہمہ تن دل زباں نہیں

جز گریہ مثلِ طفل ہماری زباں نہیں
کیا دردِ دل ادا ہو کہ تابِ بیاں نہیں

مانوس ہے مہر و مہِ دلستاں نہیں
اور آشنائے صبر بھی یہ ناتواں نہیں

تاثیرِ سوزشِ تپِ اُلفت سے مثلِ شمع
میرا ہے جسم مغز تمام استخواں نہیں

تاریک تنگ گردِ کدورت سے کب تلک
دل ہے ہمارا یا وہ کچھ مرداں نہیں

زندانِ دہر میں ہے وہ زنجیر کی صدا
جز نالہ ناتواں کا ترے کچھ نشاں نہیں

نزدیک تھا تڑپ کے ہلا دے زمین کو
پاسِ ادب سے دور تیرا ناتواں نہیں

تیرے ہوائے شوق سے محکم ہو تو پھر
مانندِ بلبلوں کے مرا آشیاں نہیں

وہ دل بسانِ شیشۂ ساعت ہی درد ہے تو
جز گردِ تفرقہ کے کوئی درمیاں نہیں

جو فیض چاہیئے درِ دولت سے دل کے لے
جز فتح باب کوئی یہاں پاسباں نہیں

خاطر مری اس کی ضعف سے میں ہی بچا سکا
شکوہ فرامشی کا کروں کیا زباں نہیں

جاں کے لئے بدن کو کیا میں نے خاکِ عشق
ہونا عزیز کس کو بھلا میہماں نہیں

اصرار یوں نہیں ہے مناسب بیاں نہیں
ہم خوب جانتے ہیں کہ تم کو دہاں نہیں

ہاں گر کہو تو ہے جو نہیں بولو ہاں نہیں
یہ امر آپ کا ہے مرے تن میں جاں نہیں

جو ساتھ ساتھ اپنے وہ سروِ رواں نہیں
قابل نظارہ کرنیکے اب بوستاں نہیں

موجود ہر کہیں ہے پر اس کا نشاں نہیں
جلوے میں روئے جمال کہاں ہے کہاں نہیں

تیغِ نگہ سے اس کا مسخر جہان ہے
لو کب اسیرِ زلف مہِ آسماں نہیں

ہے شوق بس یہی کہ تجھے دیکھتا رہوں
لیکن حجاب دور بھی ہو یہ گماں نہیں

کھولو جو کان کو تو بنے پُر گہر صدف
ابرِ بہار ہے یہ ہمارا بیاں نہیں

ہیں آبلے کہیں درِ مضمون آبدار
بے جوہر الغرض مری سیفِ زباں نہیں

سر بیچ بیچ کرتے ہیں سودائے عشق ہم
یہ وہ معاملہ ہے کہ جس میں زیاں نہیں

تجھ سا سدا بہار چمن میں بنا کے پھول
ہاتوں کو اپنے چومتا کیوں باغباں نہیں

دوزخ مقام جنتِ عالی مقام ہے — دل میں ہمارے یادِ رُخِ گلرخاں نہیں

اسرارِ دل کے کہتا ہوں پردے میں شعر کے
کیا عشق اس کو سمجھیگا تو رازداں نہیں

بلبل خزاں میں مرگئی شورِ فغاں نہیں — مجلس عزا کی ہے چمن اور نوحہ خواں نہیں

مکتوبِ شوق اُس کی طرف کب رواں نہیں — کب نوکِ خامہ مثلِ مژہ خونچکاں نہیں

کیا شوقِ بوسۂ لبِ ساقی ہے دیکھیے — کب مثلِ جامِ بادہ مرے لب پہ جاں نہیں

تابِ نظر کو پیچ کو زلفوں کے دیکھہ یار — یہ دُودِ آہ سلسلہ جنباں کہاں نہیں

اے دل ہی مانگ اُس کی رہِ کعبۂ صفا — رُتبے میں یک خس کے یہاں کہکشاں نہیں

ثابت ہوا تمہارے رُخِ پُر فروغ سے — شعلے کو طور کے جو سنا تھا دھواں نہیں

ہو گردِ راہ اُن کی یہ پایا ہوں میں عروج — اُس خاک کی زمین ہے یہ آسماں نہیں

دیکھو جو اُس کو غور سے دل داغ داغ ہو — آئینہ بہار ہے برگِ خزاں نہیں

باغِ جہاں میں وہ گلِ پژمردہ ہیں کہ آہ — گلچیں ہمارا کوئی بجز باغباں نہیں

مثلِ ستارہ نشترِ مژگاں کے شوق میں — باہر ہیں یاں مرے دل میں رگ گوں کا نشاں نہیں

جلتا ہوں ہجر میں کہ ہوں فانوس کا چراغ — نزدیک میرے ہے تنِ ناتواں نہیں

اے شمعِ بزمِ حسن جو دعوت نہ کی تو کیا
پروانہ تیرا عشق ہے کچھ میہماں نہیں

بیجا گلی میں اُس کی یہ شورِ سگاں نہیں — پر کیا کروں شکستہ ہے دورِ استخواں نہیں

اک شب بھی آتے پاس پئے امتحاں نہیں
حُسنِ یقین میرا ہے تم بدگماں نہیں

بے چین کچھ بھی جب مرا آرامِ جاں نہیں
کیسے کہوں کہ واقفِ دردِ نہاں نہیں

نسبت ہمارے بیچ ہے وہی شخص و عکس کی
تیرے سوائے میرا کہیں اب نشاں نہیں

منہ دے نہ آئینہ کو حیا کی بھی شرم رکھ
یہ شوخ دیدہ یار ترا رازداں نہیں

گر شبنمِ آئینہ میں حیا کا نہیں ہے نور
کیوں سرمہ دینا اس کو ترا آستاں نہیں

قاصد پرا کنہا ہے کہاں شوق میں تیرے
سیلابِ تنگ ساتھ کب اس کے رواں نہیں

برباد بوئے گل کی طرح کیوں کرے ہے تو
گلزار کا یہ رنگ ہے بلبل فغاں نہیں

فریادِ جا مشی میں ہے گوش و زباں یک
جز غنچہ اس چمن میں مرا ہمزباں نہیں

بیگانہ خوئی آپ کی کافی نہیں ہے کیا
دروازہ پر ضرور سگ و پاسباں نہیں

وحشت سے ہی ملی ہوئی رنگینیٔ کلام
یہ سنگلاخ دیکھو کم از گلستاں نہیں

میں مانتا ہوں قول کو مومن کے دل سے عشق
"جو فتنہ خیز اب ہے زمیں آسماں نہیں"

کچھ لعل ہی یہ سوزِ جگر کا گماں نہیں
ہے کون تیرے لب سے جو آتش بجاں نہیں

کیا آگ میرے دل کو جلاتی زباں نہیں
اب حالِ دل بھی کہنے کی تاب و تواں نہیں

اُس شمعِ بزمِ حُسن کی ہیں دلفروزیاں
پژمردہ دل نہیں مرا آتش بجاں نہیں

مرنا ہزار جان سے تجھ پر ہوں تو بھی آہ
منظور میری زیست تجھے میری جاں نہیں

کس قافلہ کا ہے دلِ نالاں مرا جرس
گذرا نہ ایک دم جو بآہ و فغاں نہیں

سہتے جفائیں ہو تو چلے ہم تمام اور — ہونا تمام اُن کا ابھی امتحاں نہیں
ظاہر ہوئی کشش نہ نمایاں ہوا ہے زخم — غمزہ نہیں ہے تیر وہ ابرو کماں نہیں
مسجد کو دیر کو نہ گیا میں تو کیا ہوا — کیا سجدہ گاہِ خلق ترا آستاں نہیں
منہ پھیرتے رقیب مرا اس ناتواں سے کیوں — کتوں کا طعمہ پوست ہے میرا استخواں نہیں
غم تیرا کیا بسا دلِ خانہ خراب میں — دل جسم میں نہیں ہے مرے دلمیں جاں نہیں
اُس نے سفر کیا تو ہے جاں پائے در رکاب — گلگونِ اشک کی مرے کف میں عناں نہیں

رونا اُٹھا ہے گھر سے ترے عشق رو کے لے
قابل شنائے بحر کے یہ ناتواں نہیں

مہ رو مرا قریں ہے تو خوفِ قراں نہیں — گردش کا تیرے کچھ بھی خیال آسماں نہیں
تیغِ زباں سے اُس کی کسی کو اماں نہیں — اور کیا جوابِ تلخ سے شکر فشاں نہیں
یہ سخت جانی اپنی بھی کچھ رائگاں نہیں — اک دم نہیں جو تیغِ ستم کی فساں نہیں
شوقِ نظارہ میں ہیں ہوئے گھر مرا اجاڑ — میں بھی چمن میں ہوں خبرِ آشیاں نہیں
غم تیرا تیرے آنے سے دل سے نکل گیا — سچ کہتے ہیں کہ عیش و خوشی جاوداں نہیں
ہیں مرتے مرتے ایک نظر تجھ کو دیکھ لوں — ہے شوق دیکھنے کا مجھے فکرِ جاں نہیں
آرام کے خیال کا دل پر جو ہو گذر — کہتا ہے درد دور کہ خالی مکاں نہیں
یوں چاٹ چاٹ تیغِ زباں کو کیے ہے تیز — لبِ لعل آبدار ہے سنگِ فساں نہیں
رہتا ہے تیر اُس کا دلِ چاک چاک میں — اُس مرغِ تیز پر کا کہیں آشیاں نہیں

گر جاں گئی تو اس کی جگہ شوق ہی ترا — کب ملکِ دل میں اس کی حکومت رواں نہیں

غالبؔ کی طرز پر بھی سنا دے کوئی غزل
کیا عشقؔ تو ذلیلِ رہِ شاعراں نہیں

ہاں آسماں اثر سے یہ شور و فغاں نہیں — لفظِ کہن میں معنیٔ تازہ سے جاں نہیں
ہر دم ہے تیری یاد میں پاسِ نفس مجھے — نزدیک تجھ سے دور ترا پاسباں نہیں
جور و ستم سے تیرے ہوں ممتاز خلق میں — خلعت یہ فخر کی ہے ترا امتحاں نہیں
مجھ کو خفیف کر کے نہ پچتاؤ بار بار — جو بار دو گے تم سو وہ دل پر گراں نہیں
ہر لفظ ایک بحر ہے ہر معنی ایک کان — خاطر میں نکتہ سنجوں کے کچھ بحر و کاں نہیں
گردش جو دیکھ لی تھی ان آنکھوں کی ایکبار — چکر سے چین پایا ابھی آسماں نہیں

اور اک غزل کے سننے کا ہی شوق دل کو عشقؔ
میں بھی تو شعر فہم ہوں کیا قدرداں نہیں

ہم سے ہوا سلوک جو تم پر نہاں نہیں — کب ذکرِ خیر آپ کا وردِ زباں نہیں
جب جائے دل کی کوچۂ زلفِ بتاں نہیں — ہے مرغِ پر شکستہ جسے آشیاں نہیں
اپنا مکانِ خاص تو جز لامکاں نہیں — ہے یہ بھی اک نشان کہ تھا کچھ نشاں نہیں
سودا یہ سود کا ہے سراسر زیاں نہیں — کب گرم اس کیا میں میری دکاں نہیں
رہنا تھا دل میں درد گیا اس کو چھوڑ دل — کیا طرفہ ماجرا ہے مکیں ہے مکاں نہیں
زاہد تو نیک اور رہوں بد میں جو دیکھئے — آپس میں غیر فرقِ عیاں و نہاں نہیں

تھا دل غریب مسکنِ بیگانہ ہو گیا — جز بیتِ ابروِ صنم اس کا مکاں نہیں
طاقت نہیں کہ دور کروں دل سے اضطراب — مالک ہے اس مکان کا وہ میہماں نہیں

اے عشق بس کہ شورِ قیامت بپا ہوا
آوازِ صور کی سی ہے تیری فغاں نہیں

کب بدگماں خیال میں موئے میاں نہیں — کب ضعفِ دل کا یار میں رازِ نہاں نہیں
دل تھا کہ آئینہ تھا تمہارے خیال کا — ہر چند ڈھونڈھتا ہوں پر اس کا نشاں نہیں
میں دردِ دل چھپانے کا حاصل کہوں ہے کیا — کر دیگا یہ تبسمِ پنہاں عیاں نہیں
منہ کو چھپا کے ہوتے ہو تم کیوں کنارہ گیر — بوس و کنار کا تو سخن درمیاں نہیں
لے اے غبار میری بنی پردہ دار ہے — خوفِ نظر کسی سے تجھے آسماں نہیں
دشمن بھی ترس کھانے لگے حال پر مرے — ممنون ہیں تمہارا کبھی دوستاں نہیں
جوہر نہیں یقین یہ رکھتے ہیں ماہرو — کب تجھ سے آئینہ پہ کتاں کا گماں نہیں
ہستی عدم میں رہنے کی تکرار کس لیے — دیتے گواہی کیا ترے لب اور دہاں نہیں
اک سطرِ خوں سے ہے لکھا عرضِ حالِ دل — اے یار دیکھ نالۂ آتش فشاں نہیں

سر چشمۂ حیات کی ہے موج دلربا
ابرو تمہاری تیغ نہیں اور کماں نہیں

محوِ خموشی کہیے تو کس وقت ہم نہیں — یہ بھی زیادہ گوئی سے سمجھو کہ کم نہیں
کہتے ہیں گرچہ عاشقِ حیران ہم نہیں — آئینہ دارِ شرم مگر کب قسم نہیں

ہنستا ہوں دیکھ دیکھ مژہ اُن کو کہ نم نہیں
کیا صورت اُن کی غیرتِ باغِ ارم نہیں

مجھ سے تو حال بھی نہ لکھا جائیگا کبھی
اُس سادہ رُو کا عشق ہے شوقِ رقم نہیں

فرطِ غرورِ حسن و نزاکت سے کہتے ہیں
ہم سرگراں نہیں ہیں کہ گردن میں خم نہیں

میں جانتا ہوں پیاسے مرے خون کے ہو تم
کیوں بے محابا چھوڑتے کھانا قسم نہیں

دلبر کا اپنے شکر ادا کس زباں سے ہو
وہ دل نہیں ہے سینہ میں وہ درد و غم نہیں

جب سے کہ پاس کا دل وارفتہ رام ہے
اس کو کسی سے پھر بجز آرام رم نہیں

بیدم جھکے مجھ کو تو دم دیتے ہی رہے
دم بھر تا اُنکا کب میں رہا دمبدم نہیں

حاصل مرادِ مے کے پیالے سے ہے تمام
کچھ غم نہیں میسّر اگر جامِ جم نہیں

وا مقامِ عشق کا جز غم نہیں کوئی
سرتا قدم جو ہم ہی رہے ہم تو ہم نہیں

اے شاہِ حسن ناز ہے کیا مجھ فقیر پر
محتاج کا غنی پہ کچھ کب کرم نہیں

آنسو کے بدلے آنکھ سے حسرت ٹپکتی ہے
دریائے اشتیاق میں دیکھو کہ نم نہیں

کیونکر ہے اپنا شیشۂ ناموس چور چور
اُس طفل کے تو ہاتھ میں سنگِ ستم نہیں

کیا داغِ دل کی عشق کہوں تو رباریاں
ایسا کوئی چراغ بدیر و حرم نہیں

اُن کے کرم سے کیا کہیں آگاہ ہم نہیں
اتنا تو جانتے ہیں ستم پہ ستم نہیں

کیا کیا دل اور جان پہ رنج و الم نہیں
گر اُن کی ہے اسی میں خوشی کچھ بھی غم نہیں

کس کی نگہ سے لشکرِ غم بے نشان ہے
پرچم نہیں ہے شعلے کا نالہ علم نہیں

بھوکے اسیر آپ کے کھانے میں بے داغ کیا | بیدانہ ہے یہ دام و لے بید رم نہیں
ناصح کا قول مانے مرا دل کہاں کی بات | میری کبھی تو کچھ کبھی موثر قسم نہیں
ہستی ہماری محوِ فنا سر بسر رہی | اک دم نہیں کہ گردِ طریقِ عدم نہیں
یوں لفروز تیری طلب ہے، تو کون ہے | جوں شمع گرمِ راہ جو سرتا قدم نہیں
دکھلائے پر بھی چہرے کو بیمار کے ترے | حیرت ہے چشمِ آئینہ میں کچھ بھی نم نہیں
فکرِ جوابِ نامہ کھپاتی ہے جان کیا | کیا کیجے اپنے ہاتھ میں اُن کا قلم نہیں
اک سادہ دل کے صفحہ سے روشن سواد ہوں | جوہر کا بھی اس آئینہ میں کچھ رقم نہیں
کیا ماہِ نو کو ہمسری ابروئے یار سے | جب آسمانِ نازو ادا اس کا خم نہیں
سودا نہ ہوگا دل کبھی سودا یہ چھوڑ دے | بازارِ حسن میں تو کہیں قدرِ غم نہیں

مومن کی جان تازہ اگر ہو اسی سے ہو
روح القدس سے عشق ترا نالہ کم نہیں

اے دل میں دین و کفر سے شادی و غم نہیں | بیت الحرام کب ہے جو بیت الصنم نہیں
کب اُس پری سے آپ بھلا متہم نہیں | کیا مجھ سے ملنے حیلہ یہی مغتنم نہیں
بایکدگر ہو خوش کہ ہوئیں کبھی ستم ظریف | عینِ کرم ہے مجھ پہ یہ تیرا ستم نہیں
دل سے ہمارے اُن کا دہن تنگ ہے بہت | غم سے ہمارے اُن کا تبسم بھی کم نہیں
خورشید رو وہ آگیا رونے کو میرے پاس | حیران ہوں کہ دیدۂ خونبار نم نہیں
مر مر کے جی گئے ہیں بہت اُس کے شوق میں | آبِ حیات لب ہے ترا یار سم نہیں

عاشق کا تیرے نام و نشاں تک بھی مٹ گیا — لوحِ مزار پر بھی رہا کچھ رقم نہیں
طاقِ مزار ساتھ لئے پھرتے ہیں ضعیف — کچھ پشت اُن کی بارِ تعلق سے کم نہیں

دیکھا فنائے عشق میں جب سے بقائے حسن
ہوں نیستیٔ ہست کہ ہستی عدم نہیں

ہے یوں ستم کا شوق جو تم کو تو غم نہیں — غصہ کے بدلے غم ہی رہے دل میں ہم نہیں
رونا یہ اپنا دیکھو تو ہنسنے سے کم نہیں — غم کی خوشی سے پھولے ہیں دیدے ورم نہیں
گالی نہ بد دعا نہ مرے سر کی ہے قسم — کیا ہو گیا قصور کہ مجھ پر کرم نہیں
گر حکم ہو تو سر سے میں اُٹھ جاؤں کا ابھی — پر کیا کروں کہ ضعف سے اُٹھتا قدم نہیں
غم ہے تپش ہے درد ہے حسرت ہے سوز ہے — سب کچھ وہی ہے مجھ میں مگر ایک دم نہیں
اُس لعل لب کے تلخ جوابوں پہ غش ہوں میں — ہے بانمک شراب مگر کیف کم نہیں
تجرِ بر شوق دیکھیہ اگر وہ ہوئے ہیں تیز — کر جاتے آ کے ہاتھ مرا کیوں قلم نہیں

سو عافیت ہیں ایک نہیں میں "نہیں" نہ چھوڑ
آغازِ عشق ہے ابھی بالخیر تم نہیں

ہم جو جسمِ نزار رکھتے ہیں — جان امیدوار رکھتے ہیں
سب فسوں گو ہزار رکھتے ہیں — پیچ کاکل کے مار رکھتے ہیں
تیری آنکھوں کے شوق میں ہم تو — سر ہے جب سے خمار رکھتے ہیں
دل میں تابِ تواں نہیں باقی — حسرتِ انتظار رکھتے ہیں

داغ باغِ مراد تازہ ہے — گُل دائم بہار رکھتے ہیں
تجھ سے حاصل ہوا یہی اے گُل — دل میں اک خار خار رکھتے ہیں
تو بھی کچھ سُن لے ہم غریبوں کی — خواہش امیدوار رکھتے ہیں
ایک قول و قرار سب کیا ہیں — ہم نہیں برقرار رکھتے ہیں
دلِ خُرم نہیں ہے سینہ میں — داغ اک یادگار رکھتے ہیں
قہر کے تم وہ ہوئیں اڑا دیتے — گیسوئے تابدار رکھتے ہیں
کون سنتا ہے کیا کہیں ہر دم — نالۂ زار زار رکھتے ہیں
پرورش نفس کی نہیں بیکار — سنگ یہ بہر شکار رکھتے ہیں
اک لچک بس ہے جان لینے کو — کیوں کمر میں کٹار رکھتے ہیں
کیوں بُرے مجھ سے ہونے ہو پیارے — تم تو خوبی ہزار رکھتے ہیں
اس چمن میں جو پھرتے ہیں دلبر — بار اک بار بار رکھتے ہیں
کیا فدا جز سخن کریں تجھ پر — یہی بہرِ نثار رکھتے ہیں
بیوفائی تری رہے کب تک — ہم وفا یا بیدار رکھتے ہیں

عشق کے جو اسد علی خاں[1] ہیں
منتِ بے شمار رکھتے ہیں

ہے شوق لپکا ترے جس کے دیدۂ تر کو — سلام تشنگی کرتی ہے اس کی کوثر کو

---

[1]: حیدرآباد کے ایک قدیم منصبدار جو مصنف کے کلام کے بے حد قدردان تھے۔ ۱۲

ہوا ہے یار تن اب اس کو میں ٹپکتا ہوں — گیا نہ راہ میں اس کی تو کیا کروں سر کو

جگر سے لب تلک آگ لگ اٹھی اب تو — لگائے منہ سے مرے ساقیا تو ساغر کو

غضب ہے بات مری دل کی دل میں رہ جائے — رسائی گوش تلک اس شوخ کے ہو گوہر کو

تباہ حال مرا دیکھ خلق روتی ہے — نہ آیا رحم کبھی آہ اس ستمگر کو

جو موجزن تھا شب ہجر اشک کا دریا — گرایا آنکھ سے کیا کیا نہ ہم نے اختر کو

تمہاری راہ میں دیکھوں بھلا سبب کیا ہے — نہ جھپکی آنکھ مری دیکھتا رہا در کو

سمجھ کے شوق میں اک موج چشمہ کوثر — لگا لوں اپنے گلے سے میں اس کے خنجر کو

پڑا ہوں ضعف میں اس بن یہ کیا جلاتا ہے — خدا کرے کہ لگے آگ ایسے بستر کو

لکھونگا شوق میں وہ نامہ دراز اب یاں — کہ سمجھے سلک گہر بار خط مسطر کو

کہاں ہے حال کہ سنئے تمہارا قال اے عشق
خدا کے واسطے کھولو نہ اپنے دفتر کو

کہاں کا چین کدھر نیند تیرے مضطر کو — کہ دے چکا ہے سب آرام اس نے بستر کو

غضب ہے پیری میں یہ داغ عشق دل آہ — چھپا دے روئی میں کس طور کوئی اخگر کو

سبھوں کو اس پہ گمان ہو گا دیدۂ تر کا — دکھاؤں داغ جو میں آفتاب محشر کو

ہوائے شوق میں اڑتی ہے حسرت پرواز — جو بند ہوں میں قفس میں تو کیا کروں پر کو

رلانا میرا ہنسی سے نہیں تمہیں منظور — نکال دانت نہ غلطاں کیجے گوہر کو

بغیر شربت دیدار کیا تشفی ہو — ہے کیسا تشنہ ترا دیکھ دیدۂ تر کو

نہ بند اُس کو کرو دم بھی مجھ پہ کر دو تم اپنا جان لئے لب میرے فسوں گر کو
غمِ فراق ہے طوفاں تو صبرِ دل کیا ہے یہ موجِ اشک بہا لے چلی ہے لنگر کو
سبھی ہیں بزم میں غش کس ادا سے چلتا ہے ملے جو ہاتھ سے ساقی کے پاؤں ساغر کو
وہ لب ہے اُن کے ہوا اسیر دو جہاں میں نہ چاہو آبِ حیات اور آبِ کوثر کو
بغیر ذکرِ غمِ عشق یہ نہیں لگتا الٰہی کیا کروں میں اس دلِ مکدر کو

سلوکِ شوق میں اب مجھکو عشق لازم ہے
بسانِ خامہ چلوں راہ پاؤں کر سر کو

بیان کیا کروں میں اپنے حالِ ابتر کو کہ دل تو کھو چکا دیکھا نہیں ہے دلبر کو
کیا ہے آئینہ بیمار تیرا بستر کو تری ہوا میں بس ہے دم ہی اس کا دم بھر کو
تڑپ یہ میری بچھونوں کہ کب سلا دیگی تمام فرشِ زمیں بس نہیں ہے بستر کو
گیا جو دل تو یہ رو دے کہ چشم کھو بیٹھے الٰہی روئیں ہم اب کیسا دیدۂ تر کو
نظر سے بچ کے مری آنکھ میں ہی آ بیٹھے میں اپنی آنکھ یہ کہوں کیسے اُن کے منظر کو
وہ شوخ دیدہ مُعالج ہوا ترا یہ دل گڑا ہی دیکھا رگِ جاں میں نیچے نشتر کو
نہیں یہ کھلتا کہ کب شوق آزماتا ہے کسی کی بندش درِ ستے کسی کی ٹکر کو
نہیں ہے دُود کہ دل میں وفا ہی جلتی ہے ہے بوئے عود سے بھی ننگ اپنے مجمر کو
سیا جو جیب تجھے پھر کام ہو گا سینہ کا ہے یاد پوچھو تو بخیہ گری بھی رفوگر کو
انہیں کے ہیں بھی تو ہر دم جبیں یہ پڑتا ہو ہے قمر بازی کا دعویٰ یہ چین کی ٹھوکر کو

نہیں ہے تنگ کہ تیرے شوق میں دیدۂ تر
کریگا دامنِ پر گُل کنارِ محشر کو

نجانوں عشق کہ یوں خارِ دیدۂ مردم
کیا ہے شوق نے کس گُل کے جسم لاغر کو

سکھایا کون یہ تیوری چڑھانا دلبر کو
دکھاتا آئینہ رُو سے ہے وہ جوہر کو

نجانوں ہوئیگی آخر برابری کیونکر
تمہارے ناز سے مجھ خاک سے برابر کو

اُسی نے بے سر و پا کر دیا ہے مجھ کو آہ
میں جانتا تھا دلِ خود پسند خود سر کو

فلک کو دیکھ رہی ہیں کہ کب پھرانی ہے
تمہاری چشم کی گردش ہمارے چکر کو

ہمیشہ سنتا ہے فریادِ العطش میری
دکھاتا دُور سے مجھ کو فلک ہے ساغر کو

ہم اپنا دشمنِ جاں کر چکے تری خاطر
دلِ شفیق رفیق اپنے یارِ یاور کو

فدا ہے رتبۂ عاشق کہ پائے بلبل پر
نثار کرتا ہے معشوق گُل سر و زر کو

امیدواری میں سکی جو دل سے کھینچوں آہ
بلند دیکھیے اک شاخ نخل بے بر کو

ہوائے شوق میں اس بام کے ہی اُڑتا دل
حرم ہے سمجھے تھے ہم واہ اسی کبوتر کو

وہ شمع رُو ہے مرے سوزِ دل سے ہی مضموں
کہ ایک بُت نہ ملا ہوگا ایسا آذر کو

جلایا دل تو رُلائے گا شوق مجھ کو عشق
ضرور آب ہے جب آگ لگ چکے گھر کو

دیا گیا تھا مرا نامہ کب کبوتر کو
کہ کر دیا نہ ہو پروانہ اس کے ہر پر کو

پسند آنا مرے پاس گر نہیں اُس کو
بلا تو لیوے مجھے یار اپنے ہی گھر کو

رقیب ہوں کہ ترے اقربا ہوں کیا پروا
کیا ہی میں نے تو اب دور دل سے سب ڈر کو

ہوائے مہر میں ہر ذرہ کیا چمکتا ہے
نہیں خیال تو کیا کیجے بندہ پرور کو

شب فراق مرے داغ کیا فروزاں تھے
کہ تاب دیکھنے کی بھی نہیں تھی اختر کو

ہیں پاؤں سوتے تری جستجو میں پھر پھرتے
ہے کوئی رہ پہ جو پہچانے پاؤں سے سر کو

ہلال عید کا دھوکا ہوا نہ مجھے ناگاہ
جو دیکھا ہاتھ میں قاتل ترے میں خنجر کو

گذار راہ طلب کیوں نہ ہووے پھر آساں
جو ساتھ اپنے رکھوں شوق میں رہبر کو

جلال پیر مغاں دیکھو جس کے اب در پر
سوال کا بھی نہیں ہے مجال قیصر کو

غبار دل کا مرے گفتگو سے ظاہر ہے
ملایا خاک میں کیا ہیں بھی آب گوہر کو

لکھے گا خط کوئی اصاف عشق کو شاید
پھر اور کیا کرے حسن اس کا مشک و عنبر کو

کرے گا زیر و زبر عشق دل کے کشور کو
کہ لایا ساتھ غم و درد سے ہے لشکر کو

نہ ہو گا پیاسا مرے دل کے خون کا شاید
کہ پی گیا وہ لب لعل آب گوہر کو

اسی شکاری کی طرز ستم کا مارا ہوں
جو چھوڑ دیتا ہے کر زخمی صید لاغر کو

سمایا سر میں مرے آج کل یہ سودا ہے
کہ یاد بھی نہ کروں دل کو اور دلبر کو

فلک سے کام لیا عاشقی میں عالم نے
کہ دو ضرور تھا اس بحر میں شناور کو

شراب عشق سے کیا میرا فہم خوب ہوا
کہ محض خیر سمجھنا پڑا ہے ہر شر کو

ہیں واعظ اب کے یہ مصروف امر بالمعروف
کہ مطلقاً ہیں گئے بھول نہی منکر کو

سلوک و سنت و توحید کا بیاں مقصود | کہ قصہ خوانوں نے رکھا ہے واب منبر کو
جو نکلا نالہ مرا لختِ دل ہی لے نکلا | نہ دیکھا ہوگا فلک ایسے تیر اور پر کو
ہے نیزہ باز سپاہی مرا دلِ نالاں | قطعہ | کہ ساتھ رکھتا ہے تیر و تفنگ و خنجر کو
مگر جگر ہی پہ ہے صرف سب ہنر اس کا | کروں سو کیا نہ ہوں بیٹھتا جو میں سر کو

سنا نہ عشق میں احوال اپنا ہوں ہم
نیا ہے دیکھئے اس قصۂ مکرر کو

مقام دل نے کیا اپنا دیدۂ تر کو | ہوا پسند سمندر بھلا سمندر کو
جو خونِ دل سے مرے ان کے لب کو نسبت ہے | کہاں یہ ربط میسر ہو شیر و شکر کو
سوال دل میں یہاں لب پہ ہے جواب وہاں | الٰہی کیا کرے ایسے کوئی مقدر کو
بھلا یہ سنگِ درِ یار کیوں نہیں ہوتا | کہ اپنے درد کی بھی اب خبر نہیں سر کو
شکستہ پا ہوا جوں رنگِ نالۂ بلبل | کہ بوئے گل سے لیا مستعار شہپر کو
نہ قتل ہونے میں انکار ہے نہ کچھ دعویٰ | قبول کرلے جو قاتل ہی میرے محضر کو
جہاں سیاہ نظر مجھ کو آ رہا ہے اب | کرم سے جلد دکھا دو رخِ منور کو
ہزار شکر کہ دل ہے غنی بدولتِ فقر | فراغت ایسی کہاں ہے کسی تونگر کو
بروزِ حشر بہت گرم ہو رہے خورشید | کروں گا چادرِ سر اپنے دامنِ تر کو

وہ آبِ چشمۂ حیوان سے سیر ہو گا عشق
دکھاؤں آئینۂ شعر اگر سکندر کو

جگہ تو دل میں ہی دی اُس بتِ ستمگر کو ‏ اُتار شیشہ میں کیا تو نے عشق پتھر کو
شکستہ رنگ بھی چہرے سے اُڑ چلا میرے ‏ کیا ہُو نا مہ بر اپنا میں مرغِ بے پر کو
پھپھولے ہجر کے دل میں پڑے قدم سے مرے ‏ نثار دامنِ صحرا کیا یہ گوہر کو
تمہارے کان کے موتی کو دیکھ حیراں ہوں ‏ کہ ساتھ مہر کے دیکھا نہ تھا میں اختر کو
میں رنگِ زرد سی اپنے ہوا بہت حیراں ‏ اثر رُلانے کا کیا کیا ملا یہ کیسر[۱] کو
جلا کے سوزِ دروں سر کو آہ راکھ کرے ‏ رکھے نہ دیدۂ تر نم جو میرے بستر کو
دمِ اخیر یہی آرزو ہے عاشق کی ‏ اُڑا دے ہاتھ سے اپنے تو اُس پہ چادر کو
وہی تماشا دکھاویگا ہجر مجھ کو آہ ‏ دکھایا اُس نے جو یعقوب سے پیمبر کو
سیاہ کاریٔ ہجراں میں کیا کہوں تم سے ‏ سپید دیکھے ہے آنکھوں کو اور مرے سر کو
خدا نخواستہ حاصل اگر نہو دیدار ‏ شبِ فراق ہی سمجھونگا روزِ محشر کو

سنا ہے تم نے کسی سے اگر سخن اچھا
سنا ہی دیگا سنو عشق اُس سے بہتر کو

دکھاؤں آئینۂ چشم کے جو جوہر کو ‏ تو کر دوں بحرِ ندامت میں غرق اختر کو
وہ گھر تھا آئینہ جس سے کیا ہے باہر کو ‏ نظر میں بن کے چلا جاؤں کاش اندر کو
ابھی میں چھوڑ کے دنیا فقیر ہو جاؤں ‏ جو اُس گلی میں ہو ممکن بچھانا بستر کو
گلی میں اُس کی چلا ہوں میں بید کا مجنوں ‏ یہ ڈر یہی ہے کہ کھانا پڑے نہ پتھر کو

۱؎ :۔ زعفران ۔ ۱۲

گلی میں اُس کی جو آسودہ رہنے بھی نہ دیا — ہماری خاک سے کیا دشمنی تھی صرصر کو
کبھی نہ سیرِ چمن کا وہ پھر خیال کرے — نسیم دیکھے جو اُس مجلسِ معطر کو
حسین سارے ہیں محتاج گرچہ زیور کے — یہ زیب تجھ سے ہے سارے لباس و زیور کو
کسی کو دیر و حرم کی خبر نہ تھی تب سے — ہوا ہے سودا ترے سجدہ کا مرے سر کو
ہزار نالہ میرا بھی اے یا ہر دو کوئی طوفاں — یہ لائے جوش میں کیا کیا نہ بحرِ اخضر کو
ہے عدل عشق کا اس چشم سے مرے دل سے — ہم جو دیکھتے ہیں باز اور کبوتر کو
شکر کو مشک کو اس سے نہیں ہے کچھ نسبت — دکھا دو شعر مرا زلف و لعلِ دلبر کو

وہ آکے عشق نہ پھر جائے بے خبر نیزی
ادھر اُدھر ہے تو کیوں پھرتا چھوڑ کر گھر کو

گئے ہو بھول بہت دن سے آپ کتر کو — کروں ہوں یاد میں اس بازو بدا کثر کو
سرِ غرور بہت کچھ تھا دیدہ تر کو — قدم سے اپنے ہی پایا ہوں اُس کے ہمسر کو
کرم کرو تو اسی دم ہو میری جاں بخشی — نہ بھولو بہرِ خدا ہر دم مقرر کو
ہمارے دل کو تو اپنا کیا ہے تو ظالم — خراب و زیر کشورِ مسخر کو
تری تو راہ میں پتھر نہ تھا کوئی حائل — یہ میں قدم کے تلے دیکھا اپنے ہی سر کو
میں سخت جاں ہوں فلک تجھ کو جاودانی کی قسم — سنبھالنے دے مرے سر پر ایک پتھر کو
مریضِ عشق کا ہر دم ہے مختلف احوال — کہ ایک حال سے نسبت نہیں ہے دیگر کو
نکالتا ہے وہ مطلب کی اپنی بات سے بات — میں نیک ظن کروں کس طرح ایسے بدبر کو

عبارت اُس کی اگر خط سے خوب ہو ایجاں
تو خوش رقم ہے کہو لعل روح پرور کو

اُسی کے دل میں پتا ملگیا ترا آخر
جو چھان مارا تری جستجو میں گھر گھر کو

اگرچہ شوق میں تیرے ہوا ہوں بے سر و پا
عوض میں سر کے قدم کے رکھا ہوں جگر کو

گہر کے لعل کے طالب ہیں جوہری عشق
نہ پڑنے آنکھ میں ان کی دے اینٹ کنکر کو

کسی کو آنے نہ دوں دیکھ لے ترے گھر کو
سمجھ نہ حلقۂ در مجھ سے چشم بر در کو

یہ خامشی کا ہے اعجاز لعل دلبر کو
کہ ہونے دے نہ کبھی در کسی سخنور کو

بہت سمجھ کے کرو تم اشارۂ ابرو
گلے پہ اپنے کوئی پھیر لے نہ خنجر کو

ہوا کسی کا نہ دل سوزدہ بت بیدرد
کسی نے آگ سے خالی نہیں دیکھا پتھر کو

نہیں ہے خوف جو تجھ کو زمین آسماں تک
کہ امن اپنا سمجھتا ہوں دل ترے ڈر کو

نزاکت اپنی سمجھ کی سوا ہے شیشہ سے
میں خونِ دل ہوں سمجھتا شراب احمر کو

کیا ہے غم مرے سینہ کو صفحۂ سرمشق
کہ پسلیوں سے مرے دیکھا اُس نے مسطر کو

جو قد یار کو دیتے ہیں اس سے ہم تشبیہ
تو کیوں نہ فخر سزاوار ہو صنوبر کو

عزیز حال میں بس چھوڑ دو مرے مجھ کو
کہ دو جہاں سے نہیں کام کچھ قلندر کو

تری ہوا میں بھڑکتا ہے دل بہت میرا
فروغ کیا رہے ایجاں چراغ مضطر کو

ہے شش جہت سے نمودار جلوۂ دیدار
یہی ہے سوچ کہ اب منہ کروں میں کیدھر کو

تبھی تو عشق ہیں مضمون شوخ سب تیرے

کہ خونِ دل سے دیا رنگ میں نے ہر ہر کو

کیا ہو گیا ہے جذبۂ دل بیقرار کو — لایا نہ کھینچ گھر مرے اب تک جو یار کو
ہے ربط چشمِ تر سے دلِ داغدار کو — ہاں ابر بھی ضرور ہے اس نو بہار کو
میں کیا کروں یہ جان و دل بیقرار کو — منظور جب جلانا ہی ٹھیرا ہے یار کو
حاجت تھی روشنی کی تری راہ دیکھتے — میں نے چراغ جان لیا انتظار کو
اے دل اگرچہ ہے گل بیخار وہ جہاں — کیا جانتا نہیں ہے ترے خار خار کو
بھولا یہ کس کا جلوہ برنگِ بہار واہ — نکہت چمن کی کرتا ہے میرے غبار کو
ٹھنڈا کلیجہ اشک سے کرتے ہیں زندہ دل — آبِ حیات جانتے ہیں اس شرار کو
پھندے تعلقات کے بیکار رہ گئے — آزادی دام چاہئے تیرے شکار کو
دل دیدے میرے گر نہ جلیں ہجر میں ترے — شمع و چراغ کیا رہے شبہائے تار کو

دل داغ سے جلا تو جلے داغ دل سے آہ
خالی ہی دیکھتا ہوں میں جیب و کنار کو

توکل گر جہازِ دل کا اپنے ناخدا ٹھہرے — تو پھر بادِ مخالف بھی موافق سی ہوا ٹھہرے
برآمد ہو گئے پامال یاں انکار یا ٹھہرے — نہ ٹھہرے پر نہ ٹھہرے گرچہ باتاج و لوا ٹھہرے
اگر گرمی کی رو سے کچھ بھی انکا بادیا ٹھہرے — تو پھر دو دو قدم پر دیکھنے تھک کر ہوا ٹھہرے
عبث کیوں دل لگا کر ان سے کوئی یوں برا ٹھہرے — بہت اچھا ہوا اگر وہ جو ایسے بیوفا ٹھہرے
نگہ آفت قیامت قامت اور کاکل بلا ٹھہرے — تمہارے سایہ کے آگے پری ہو تو کیا ٹھہرے

کہیں مانع تجلی کا حجاب ناز ہوتا ہے
جو ڈھانپا منہ کو تم نے تو نہایت خوشنما ٹھہرے

بہت ناصح ہوئے پیہم اُسے کہیں میں آن ٹھہر یاں ہو
تیقن جب ہوا دل کو کہاں پھر وسوسا ٹھہرے

نہیں جانا گلی سے اُن کی اپنا بے سبب کب ہے
نہیں کھوئے تجھے دل کو ہم اُن کا کھوج پا ٹھہرے

خیال آیا تمہارے رونے میں گرچہ ان کے ہنسنے کا
کہ سارے قطرہائے اشک موتی بے بہا ٹھہرے

تمہارے دیکھنے کا شوق اُن کو یہ ہوا دیکھو
کہ جان و دل ہمارے دونوں آنکھوں میں آ ٹھہرے

خوشی سے ہم تمہارے گھر میں آتے ہیں جا ہیں
مبادا پھر جنون عشق ہی زنجیر پا ٹھہرے

تمہارا بیٹھنا اُٹھنا نہیں بیکار چلنا بھی
اُٹھے دلبر رہے دلدہ چلے تو دلربا ٹھہرے

کہے؎ جاتا ہوں تو میں نے بھی ایسی بیقراری کی
تماشا دیکھتے حیران بیچون و چرا ٹھہرے

نہیں جب بد ہی کب عید سے ہم شاد ہوتے ہیں
ہزار آوے اگر نوروز تو غم کا دہا ٹھہرے

تو ہم در بدر پھر پھر ہوئے بیزار کیا حاصل
کفیل مطلب دل اب ہمارا بس خدا ٹھہرے

ہماری کیا حقیقت ہے اتدن دیکھو مہ و خور بھی
اُسی کے آستاں پر سر بسر ہیں جبہہ سا ٹھہرے

مکان آرام کا سمجھا تھا میں نے خانۂ دل کو
نہ تھا ہرگز گماں آخر کو یہ ماتم سرا ٹھہرے

نہ بولے یار ہم سے گفتگو خاموش بیٹھے ہیں
نہ ہووے جب چمن میں گل تو بلبل بے صدا ٹھہرے

یہ کس کے ملنے کا ہے فیض حیراں ہیں نہیں معلوم
کہ بالکل ہو کے بیخود آپ سے ہم یوں جدا ٹھہرے

نہ جا سکتے ہیں یاں تھے نہ اُن کے اُن کو روک سکتے ہیں
اُنہیں کی مہربانی ہے جو ہم بیدست و پا ٹھہرے

شراب حسن سے سرشار کب تک یوں رہو گے بس
کہ ہم بھی ہوش میں آویں تمہارا اگر نشا ٹھہرے

؎ ۔ یعنے اُس نے کہا کہ میں جاتا ہوں تو میں نے ایسی بے قراری کی ۔ یہ اُس وقت کی زبان ہے ۔ ۱۲

مخالف ہیں موافق کا لیا کرتے ہیں خوباں کام
چراغِ گل کا روغن سر بسر آبِ ہوا ٹھہرے

یہ بزمِ عشرتِ عشق جہاں آشوب ہے یارو
نہو ہر دم یہاں جو رقصِ بسمل کیا مزا ٹھہرے

اسی بس بیقراری میں عزیزو ہم لیا ٹھہرے
نہ پایا چین اک لحظہ بھی پر ٹھہرے تو کیا ٹھہرے

یہ کیا قہر و غضب ہے جسکے ہم یوں مبتلا ٹھہرے
کہیں ٹھہرو جواں کو تو کہیں میری بلا ٹھہرے

نہ ہم پوشیدہ جا سکتے نہ وہ دزدیدہ آ سکتے
ہوئی تدبیر مشکل اب کہ عاشق برملا ٹھہرے

کوئی دم کے ہیں مہماں ہم شتابی سے بتا دو
ذرا ٹھہرے ذرا ٹھہرے ذرا ٹھہرے ذرا ٹھہرے

دکھا صورت کو اپنی رونما مجھ سے نہ مانگو تم
مری آنکھوں میں دیکھو اپنے آپ ہی رونما ٹھہرے

عجب مشکل کی صحبت ہے کہ کچھ بھی بن نہیں چلتا
ادب سے قیدی ہم ہیں تو وہ پابندِ حیا ٹھہرے

ثبات اے عشق یہ ہے اور اسی کا نام استقلال
حسینانِ جہاں سے مل کے پھر تم پارسا ٹھہرے

خدا جانے تال اس کا بھلا ٹھہرے برا ٹھہرے
علم کی تیغ جو اس نے تو ہم بھی سر جھکا ٹھہرے

جفا ٹھہرے سزا ٹھہرے وفا ٹھہرے عطا ٹھہرے
کرو جو کچھ ہمارے حق میں تو تم کو روا ٹھہرے

لبوں پر جان آئی ہے بجا وہ کہ تا ٹھہرے
چلے لے ساتھ ہم کو گھر ہمارے گھر میں پا ٹھہرے

تکلف برطرف کمخواب آنکھیں اپنی حاضر ہیں
بجائے فرش ان کو وہ جہاں جا بچھا ٹھہرے

پرانی دوستی ہر چند ہم انکو جتاتے ہیں
کریں کیا پھر جو سن کے سراسر وہ نیا ٹھہرے

دلِ خوں میں ہمارا بھی کرو پامالِ احساں سے
عجب تم دستگیرِ طائرِ رنگِ حنا ٹھہرے